عربی زبان کی اہمیّت

(۳)

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ
سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی

عربی زبان سامی لسانیات کا سنگ بنیاد ہے

علماء لسانیات نے دنیا کی زبانوں کو ان کی خصوصیات کی بناء پر متعدد خاندانوں یا زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں ایک خاندان آریائی زبانوں کا ہے، جن کو ہند یورپی (INDO - EUROPEAN) زبانیں بھی کہتے ہیں۔ ان میں سنسکرت، فارسی، یونانی، لاطینی، انگریزی وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر زبانوں کا ادبی سرمایہ بہت وسیع و وقیع ہے۔ اس لئے اس خاندان کو علم اللسان اور ادبیات دونوں لحاظ سے بڑی اہمیّت حاصل ہے۔

دوسرا خاندان سامی زبانوں کا ہے، جس میں عربی، عبرانی، آرامی، کنعانی، حبشی اور بابلی زبانیں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر زبانیں متروک ہو چکی ہیں، صرف عربی اور حبشی ابھی تک زندہ ہیں۔ سامی زبانوں کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ تورات کی کتاب پیدائش کے مطابق جو قومیں اِن زبانوں کو بولتی تھیں، وہ بیشتر سام بن نوح کی اولاد سے تھیں، اس لئے ان کی زبانیں سامی کہلائیں۔ سامی زبانوں ——— (SEMITIC LANGUAGES) کی چند مشترک خصوصیات ہیں۔ جو اُن کے لئے وجہِ امتیاز ہیں۔ سامی زبانوں کا ایک بڑا خاصہ یہ ہے کہ ان کے اکثر الفاظ سہ حرفی مادوں سے مشتق ہیں اور وہ مادے بیشتر حروفِ صحیحہ پر مشتمل ہیں، اگرچہ بعض میں حروفِ علّت بھی داخل ہیں۔ ان زبانوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اگر نئے الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آئے، تو یہ ضرورت اشتقاق کے عمل سے پوری کی جاتی ہے یعنی کسی مادہ (ROOT) سے اشتقاق کے ذریعے نئے الفاظ وضع کر لئے

جاتے ہیں۔ مثلاً جب اورینٹلسٹ (ORIENTALIST) کے لئے ایک مناسب عربی لفظ کی تلاش ہوئی تو "شرق" سے "مستشرق" کا نیا لفظ بنا لیا گیا، جو عربی زبان میں پہلے موجود نہ تھا۔

سامی زبانوں کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ نئے صیغے بنانے میں حرکات کی تبدیلی سے بہت کچھ کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی اسم کا جمع کا صیغہ بنانا مقصود ہو تو یہ مقصد اس کی حرکات کو بدل کر حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً اَسَد سے اُسُد اور کِتَاب سے کُتُب۔ یہی قاعدہ افعال میں بھی جاری ہے، مثلاً اگر کسی معروف فعل کو مجہول بنانا مطلوب ہو تو اس غرض کے لئے اس کی حرکات کو بدلنا کافی ہے۔ جیسے ضَرَبَ سے ضُرِبَ، یَضْرِبُ سے یُضْرَبُ۔ علاوہ ازیں مختلف ابنیہ کے ساتھ خاص خاص مفہوم وابستہ ہیں، مثلاً فاعِل، فعِیل، فعّال، مَفْعَل، فُعال اور فُعّالہ خاص خاص معنے رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ سامی زبانوں کے کچھ اور خصائص بھی ہیں، لیکن ہمیں سردست سامی زبانوں کی امتیازی خصوصیات سے بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اس امر کی وضاحت مطلوب ہے کہ اسی قسم کی مشترک خصوصیات کی وجہ سے عربی زبان کے مطالعہ سے دیگر سامی زبانوں کی ساخت اور ان کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور اس لحاظ سے عربی گویا سامی لسانیات کا سنگِ بنیاد ہے۔

یہ بات اغلب ہے کہ سامی قوموں کا اصلی وطن عرب ہی کا خطہ تھا اور سامی قومیں اسی ملک سے اٹھ کر وقتاً فوقتاً بابل، الجزیرہ، شام، فلسطین، مصر اور حبشہ کی سمتوں میں جا کر آباد ہو گئی تھیں۔ عرب ہی وہ مرکزی مقام ہے جس کی زبان سے دوسرے ملکوں کی سامی زبانیں پیدا ہوئیں، لہٰذا تمام سامی زبانوں کی اصل عربی زبان ہی قرار پاتی ہے۔ عربی زبان میں ایسی دُور رس تبدیلیاں نہیں ہوئیں، جیسی اشوری یا عبرانی زبان میں رونما ہوئی ہیں۔ اشوری (ASSYRIAN) اور عبرانی (HEBREW) قوموں کو غیر اقوام اور ان کے تمدن سے واسطہ پڑا تھا، اس لئے ان کا خارجی عناصر سے متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن اس کے برعکس عرب کا ملک کچھ اس طرح الگ تھلگ واقع ہوا ہے کہ اس کی زبان بہت حد تک غیر سامی اثرات سے بچی رہی ہے، اس کے علاوہ اجنبی ملکوں کے باشندوں کی بھی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی، اس لئے عربوں کی زبان میں نہ تو تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوئی ہیں اور نہ ہی اس کی قدیم صورت بدلی ہے، لہٰذا عربی زبان کو سامی لسانیات کا سنگِ بنیاد تسلیم کرنا کسی طرح بیجا نہیں ہے۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ دیگر سامی زبانوں کے مقابلہ میں عربی کا ذخیرۂ الفاظ نہایت وافر اور وسیع ہے اور اسلامی دور کے علماء لغت نے اس تمام ذخیرہ کو اس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ مدوّن کر دیا ہے۔ اور اس کی ایسی وضاحت کے ساتھ تشریح کر دی ہے جو اور کسی سامی زبان کو قطعاً نصیب نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں پرانی سامی زبانوں کے شاذونادر الفاظ کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ عربی لغت ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں، جنہوں نے عربی کو سامی زبانوں اور ان کے قواعد کو سمجھنے کے لئے ایک بنیادی اہمیت دے رکھی ہے۔

تورات کے مطالعہ میں عربی کی افادیت

عربی زبان اور عربی تمدن کے جاننے سے تورات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس نظریہ کے پیش کرنے میں ولندیزی مستشرق شول ٹنس (SCHULTENS) متوفی ۱۷۵۰ء کو سبقت حاصل ہے، چنانچہ اس نے ایک خاص مقالہ اس موضوع پر لکھا تھا اور اس ضمن میں سامی زبانوں کے تقابلی مطالعہ کی اہمیت پر بھی زور دیا تھا۔ اور اس نے "سفرِ ایّوب" کی تفسیر لکھ کر اس اصول کی وضاحت کی تھی کہ عبرانی لٹریچر کی تشریح میں عربی محاورات اور طرزِ خیال سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ عبرانی قوم بھی سامی نسل کی ایک شاخ تھی، جو حضرت مسیحؑ سے کئی سو سال پہلے شمالی عرب کے صحراؤں سے نکل کر فلسطین میں جا بسی تھی اور وہاں بھی ایک طویل عرصہ تک اپنی قدیم روش پر راعیانہ زندگی بسر کرتی رہی۔ لہذا ہم فطری طور پر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جو کچھ عربوں کی زندگی اور ان کے اطوار کے بارے میں کہا جا سکتا ہے، وہ عبرانیوں کی ابتدائی زندگی اور ان کے افکار پر بھی منطبق ہو سکتا ہے۔ اسی لئے تورات کی تفسیر میں عربی کے علماء کا اثر نہایت واضح نظر آتا ہے۔ چنانچہ پوکاک (POCOCKE) اور رابرٹسن سمتھ (ROBERTSON SMITH) نے انگلستان میں وَیلہازن (WELLHAUSEN) نے جرمنی میں تورات کی تفسیر عربی نقطہ نظر سے کی ہے۔ یعنی عربی زبان اور عربی اسلوب بیان ہی سے مدد لی ہے۔

اسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر ویلہازن، متوفی ۱۹۱۸ء، رقمطراز ہیں کہ "میں نے اپنی تحقیقات کا رخ عہد نامہ قدیم (یعنی تورات) سے عربوں کی طرف اس مقصد سے پھیرا ہے کہ میں اس نخلِ صحرائی (یعنی قوم عرب) کی حقیقت کو سمجھنا چاہتا ہوں، جس پر بنی اسرائیل کے انبیاء

اور صلحاء نے اپنی شاخ یعنی تورات کا پیوند لگایا تھا، کیونکہ مجھے اس بات میں کچھ بھی شک وشبہ نہیں ہے کہ عبرانی لوگ جس بضاعت اور استعداد کے ساتھ تاریخ کے منظر پر نمودار ہوئے تھے، اس بضاعت (یعنی مجموعۂ خصال) کا صحیح تصوّر اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب عبرانیوں کا مقابلہ عرب العاربہ (ٹھیٹ عرب) سے کیا جائے۔ اس مرحلہ پر یقیناً اس خالص عروبہ کا سوال پیش آتا ہے، جیسی کہ وہ اسلام سے پہلے تھی، لیکن اس عروبہ کا سمجھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔"[۱]

اسی طرح پروفیسر الفرڈ گیوّم (GUILLAUME) لکھتے ہیں کہ "انیسویں صدی کے اوائل ہی سے اہلِ علم کا یہ دستور رہا ہے کہ عبرانی زبان کے شاذ الفاظ اور صیغوں کو سمجھنے کے لئے عربی زبان سے مدد لیتے ہیں، کیونکہ عربی زبان لسانی حیثیت سے نسبتاً بہت قدیم ہے۔ عبرانی کے پیچیدہ اور مبہم صیغوں کو اکثر یوں حل کیا جاتا ہے کہ وہ عربی الفاظ کی قدیم شکلیں ہیں، جو عربی میں کثیر اور عامۃ الورود ہیں۔ یہودی روایات میں جن لفظوں اور محاوروں کا صحیح مفہوم غائب ہو گیا تھا، وہ عربی کے وسیلہ سے آسانی اور یقین کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ عہد نامہ عتیق کا کوئی سنجیدہ مطالعہ کرنے والا عربی کے براہ راست علم سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ عہد نامہ عتیق کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں، ان کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اس مقدس کتاب کی تفسیر عربی زبان کی کس قدر ممنون احسان ہے۔"[۲]

عربی کے اثرات عبرانی ادب پر

عبرانیوں یا یہودیوں[۳] کا عربی زبان کے ساتھ جو تعلق رہا ہے، وہ صرف اسی بات تک

---

[۱] JULIUS WELLHAUSEN: MUHAMMED IN MEDINA, DAS IST VAKIDIS KITAB-AL-MAGHAZI IN DEUTSCHER WIEDERGABE, BERLIN, 1882.

[۲] ALFRED GUILLAUME IN HIS PREFACE TO THE LEGACY OF ISLAM, P. IX. OXFORD, 1931.

[۳] عبرانیوں کی تاریخ حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ کا لقب*

(باقی اگلے صفحہ پر)

محدود نہیں کہ اس سے ان کے مذہبی نوشتوں کی تفسیر میں مدد ملتی ہے بلکہ عربی کے ساتھ یہود تعلقات اس سے بہت زیادہ وسیع اور گہرے ہیں۔

یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہودی لوگ دیار عرب میں کب جا کر بسے تھے، لیکن گمان غالب ہے کہ جب رومیوں نے ۷۰ء میں اُورشلیم (بیت المقدس) کو تباہ و برباد کر دیا تو بعض یہودی قبیلے جزیرۃ العرب کی طرف نکل گئے اور حجاز کے نخلستانوں میں جا کر آباد ہو گئے۔ بہرحال ظہور اسلام کے وقت عرب کے بعض علاقوں میں یہودیوں کو جو اہم درجہ حاصل ہو چکا تھا اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ لوگ بہت قدیم زمانے سے عرب میں آباد تھے، اور عربی زبان کے علاوہ بہت حد تک عربی معاشرت بھی اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ جاہلی شعراء میں یہودی شاعر بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ان میں سارہ نام کی ایک یہودی عورت کا ذکر آتا ہے جس نے چند دردناک اشعار میں اپنے قبیلہ قریظہ کے افسوسناک انجام پر رنج و غم کا اظہار کیا تھا۔ اسی طرح ایک یہودی سردار سموأل بن عادیا نے وفاداری اور شعر گوئی میں ایسا نام پیدا کیا تھا کہ عرب لوگ آج تک اَوْفٰی مِنَ السَّمَوْأَل کہہ کر اس کی وفاداری اور ایفاء عہد کی مثال دیا کرتے ہیں۔

جب ساتویں صدی مسیحی میں عرب لوگ پرچم اسلام کے تلے اپنے وطن سے نکل کر متمدن دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر چھا گئے اور وہاں حاکم بن گئے تو ان کی زبان بھی مفتوحہ ملکوں میں تدریجاً رائج ہو گئی، اور دیگر ذمّیوں کی طرح مملکتِ اسلام کے یہودیوں نے بھی اسے رفتہ رفتہ اختیار کر لیا۔ اور ان کے لئے عربی ایک ثانوی زبان بن گئی اور بغداد سے لے کر مراکش اور اندلس تک علماء یہود حالات زمانہ سے متاثر ہو کر عربی زبان ہی میں لکھنے پڑھنے لگے اور جو یہودی ربّی یا عالم چاہتے تھے کہ ان کے ہم قوم ان کی باتوں کو سمجھ سکیں وہ اپنی مذہبی کتابیں عربی میں منتقل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ الغرض قرونِ وسطیٰ کے یہودیوں کا دینی اور دنیوی لٹریچر بیشتر عربی زبان میں مسطور

(بقیہ حوالہ صفحہ گزشتہ سے آگے) ※ اسرائیل تھا۔ لہٰذا اُن کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور اُورشلیم کی حکومت کے ساتھ صرف یہودا اور ابن یمین کے قبیلے رہ گئے۔ یہی لوگ بعد ازاں یہود یا یہودی کہلائے۔

ہے اور اس کا مطالعہ کرنے اور اس کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کے لئے عربی زبان کا جاننا لابدی امر ہے۔

سپین کے شہر طُلَیطلہ (TOLEDO) کے یہودی زبان اور معاشرت کے لحاظ سے وہاں کی عام آبادی میں پوری طرح جذب ہو گئے تھے، اور اپنی مذہبی جماعتوں اور مجلسوں کی روئداد عربی ہی میں لکھتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی مذہبی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کر ڈالا تھا، بلکہ ہر مضمون کو اسی زبان میں ادا کرتے تھے۔ اندلس نے عربی زبان کے سینکڑوں ادیب، عالم اور شاعر پیدا کئے ہیں۔ ان میں یہودی مصنفین کی بھی ایک خاصی تعداد نظر آتی ہے، جنہوں نے دیگر خدمات کے علاوہ عربی علوم کو تراجم کے ذریعے یورپ میں منتقل کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔

عبرانی گریمر

اسلامی ملکوں کے یہودی باشندوں نے جو عربی زبان کو اختیار کیا، تو اس کا عبرانی زبان اور ادب پر بہت خوشگوار اثر پڑا۔ عرب لوگ اپنی زبان کی شستگی اور محاورہ کے صحیح استعمال پر بہت زور دیتے تھے، لہذا یہودیوں کی عربی دانی کا یہ اثر ہوا کہ ان کو اپنی مقدس زبان یعنی عبرانی کی بدحالی کی طرف توجہ ہوئی اور وہ اس کی تہذیب وتنقیح پر کمربستہ ہوئے اور اس غرض سے انھوں نے بڑے غور کے ساتھ عربی نحو کا مطالعہ کیا، اور پھر عبرانی کی صرف ونحو کے قواعد بنائے اور یہ تمام قواعدِ لسانی عربی نحو کے نمونہ پر تھے۔ اس جدید عبرانی گریمر نے جو عربی نحو کے طرز پر مدوّن ہوئی تھی، اندلس میں جنم لیا تھا۔ اس کا بانی حَیُّوج یہودا بن داؤد تھا جسے عربوں نے ابوزکریا یحییٰ بن داؤد لکھا ہے۔ وہ قرطبہ کا رہنے والا تھا، جہاں اس نے گیارھویں صدی مسیحی کے اوائل میں وفات پائی۔ اسی طرح ابن عزیر نے بارھویں صدی مسیحی میں عبرانی گریمر کا جو تصوّر قائم کیا تھا، وہ بالکل عرب نحویوں کے اسلوب پر تھا۔ اس کے بعد داؤد رِقمحی متوفی ۱۲۳۵ء کا زمانہ آیا۔ اس یہودی ربّی نے بھی عبرانی کی ایک گریمر لکھی تھی جس کو عیسائی علماء اب تک مستند مانتے ہیں۔ یہ گریمر بھی بہت حد تک عربی مصادر سے ماخوذ تھی۔

جس طرح حمیدالدین ناگوری نے "مقامات حریری" کی طرز پر فارسی میں "مقامات حمیدی" لکھے تھے، اسی طرح ایک یہودی ادیب یعنی الحارثِی نے تیرھویں صدی میں مقامات حریری کے اسلوب پر عبرانی میں مقامات تالیف کئے۔ ان طبع زاد مقامات کے علاوہ مقامات حریری کا بھی عبرانی

میں ترجمہ کر دیا گیا۔

سعدیا بن یوسف فَیّومی (۸۸۲ء تا ۹۴۲ء) نے اپنی اکثر اہم کتابیں عربی ہی میں قلمبند کی تھیں۔ ان کے علاوہ اس نے تورات کو بھی عربی میں منتقل کر دیا تھا۔ بعض قانونی مسائل کو سلجھانے میں بھی اس نے مسلمان فقہاء کے اصول کو پیش نظر رکھا تھا۔

موسیٰ بن میمون قرطبی (۱۱۳۵ء تا ۱۲۰۴ء) قرون وسطیٰ کے یہودی علماء اور فلاسفہ کا سرخیل ہے۔ وہ علمِ طب میں بھی یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ اس نے بھی اپنی اکثر کتابیں عربی ہی میں لکھی تھیں۔ اس کی بعض کتابیں مثلاً دلائل الحائرین وغیرہ طبع ہو چکی ہیں۔

ساتویں صدی مسیحی میں عبرانی شعر و شاعری کا حال کچھ ایسا تھا کہ اسے ایک ٹوٹے ہوئے رباب کے بیکار تاروں سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے، کیونکہ اس میں اس وقت قافیہ اور بحر تک کا پتا نہیں چلتا تھا۔ لیکن جب سے وہ عربی شعر کے اثر میں آئی اس میں ایسا نفیس ترنم پیدا ہو گیا کہ وہ جلد ہی عربی شاعری کی حریف بن گئی۔ مثلاً یہوداہالیوی (YAHUDA HA LEVY) نے عرب شاعروں کے طرز پر عبرانی شاعری میں "نسیب" کو رواج دیا تھا۔ چنانچہ پروفیسر میکڈانلڈ لکھتے ہیں کہ "عبرانی لوگ اپنے طرزِ خیال میں عربیت ہی پر قائم رہے، ان کا سارا ادب ابتداء سے لے کر آج تک اپنے اسلوب اور طریقِ تالیف میں بالکل عربی ادب کے نمونہ پر ہے۔ اگر عبرانی لٹریچر کے اسالیب اور اصناف کی تحقیق مقصود ہو تو ان کے نمونوں کو عربی ادبیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔"

انگریز مستشرق پروفیسر پوکاک متوفی ۱۶۹۱ء کی یہ قطعی رائے تھی کہ قرون وسطیٰ کے عبرانی ادب کا بہترین حصہ وہ ہے جو عربی دان یہودی مصنفین کے قلم کا رہینِ منت ہے۔

عربی زبان کے یہودی علماءِ مستشرقین

عربی اور عبرانی زبانوں کی اصل ایک ہے۔ اور قرون وسطیٰ کا یہودی لٹریچر بھی بیشتر عربی ہی میں مسطور ہے۔ اس کے علاوہ اس یہودی لٹریچر نے عربی ادب ہی کے زیر سایہ نشو و نما پائی تھی۔ اور اس کے اکثر اصناف و اقسام میں عربی ادب ہی کے زیر سایہ نشو و نما پائی تھی۔ اور اس کے اکثر اصناف و اقسام میں عربی نمونوں ہی کو پیش نظر رکھا گیا تھا اور اسلامی دینیات اور فلسفہ نے یہود کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی اور یہودی ادبیات میں ایک نہایت قریبی

رشتہ قائم ہوگیا اور جو یہودی علماء اپنے ادبیات کا مطالعہ کرتے تھے وہ بالآخر طبعی طور پر نہایت آسانی سے عربی ادبیات کے مطالعہ کی طرف مائل ہو جاتے تھے. کیونکہ انھیں اپنے دینی اور دنیوی علوم کی مختلف شاخوں کے نمونے عربی ادبیات ہی میں ملتے تھے. یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کے زمرہ میں یہودی علماء کی تعداد نسبتاً بہت زیادہ ہے. چنانچہ یورپ کے علماء میں سے ڈارم شٹیٹر (DARMESTETER) دیرن بورگ (DERENBOURG) گلاذر (GLASER) گولٹسیر (GOLDZIHER) ہالیوی (HA LEVY) ہرش فیلڈ (HIRSCHFELD) ہوروولش (HOROVITZ) لایٹ نر (LEITNER) مونک (MUNK) ملّر (D-H-MILLER) شٹائن شنائڈر (STEINSCHNEIDER)، وائل (WEIL)، لیوی پروونسال (LEVI PROVENCAL)، لیوی دیلاویدا (LEVI DELLA VIDA)، مِٹ ووخ (MITTWOCH) اور پال کراؤس (PAUL KRAUS) سب یہودی تھے، اور زندہ یہودی مستشرقین میں سے مارٹن پلسنر (MARTIN PLESSNER)، گوئے ٹائن (GOITEIN)، فان گرونے بام (VON GRUNEBAUM)، روزن ٹال (ROSENTHAL) اور ایلزے لشٹن شٹیڈ ٹر (ILSE LICHTENSTAEDTER) قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ خولسون (CHWOLSON)، زخاؤ (SACHAU)، اور ریکن ڈورف (RECKENDORF) اگرچہ مذہباً نصرانی تھے، لیکن اصلاً یہودی تھے۔ اسی طرح پروفیسر مارگولیتھ اگرچہ از روئے مذہب عیسائی تھے لیکن ان کا قدیمی خاندان یہودی تھا۔[1]

بلاد مشرق کے نصاری اور ان کا عربی ادب

ظہور اسلام سے پہلے جزیرۃ العرب میں جتنے مذاہب رائج تھے، ان میں ایک دین مسیحی بھی تھا

---

[1] یہ نام MARGOLIOUTH اور MARGOLIS وغیرہ کئی صورتوں میں ملتا ہے اور اس نام کے بہت سے عالم ہو گزرے ہیں جن میں سے بعض یہودی اور بعض نصرانی ہیں۔ یہ تمام افراد پولینڈ کے ایک قدیم یہودی خاندان MARGOLIOUTH سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان میں سب سے پہلے سموئیل مارگولیتھ نے نام پیدا کیا جو سولھویں صدی میں شہر پوسن کا دیّان تھا۔ اور اس کا بیٹا شہر کراکو (CACKOW) کا ربّی تھا۔ MARGOLIOUTH کا لفظ یونانی کلمہ MARGARITES سے ماخوذ ہے، جس کے معنی مروارید ہیں۔

اوراس کی اشاعت سے مختلف بلادِ عرب میں متعدد قبیلے نصرانی ہو چکے تھے۔ ان نصرانی قبائل میں غسّان کا قبیلہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو رومیوں کا حلیف تھا اور ان کے اثر سے عیسائی ہو چکا تھا۔ ظہور اسلام کے وقت نجران (یمن) کے علاقے میں بھی بہت سے عیسائی پائے جاتے تھے۔ جیسا کہ کتبِ سیرت میں تفصیلاً ذکر آیا ہے، ان کا ایک وفد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور رسولِ مقبول ؐ نے ان کی پذیرائی فرمائی تھی اور ارکانِ وفد نے چند مذہبی مسائل پر آنحضرت ؐ سے گفتگو کی تھی۔ ادبی کتابوں میں نجران کے ایک نصرانی اسقف قُسّ بن ساعدہ کا بھی ذکر آیا ہے، اس کے چند خطبات آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں جو عربی فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت کا عمدہ نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ جزیرۃ العرب کی شمال مشرقی سرحد پر حیرہ کے علاقے میں بھی عیسائی موجود تھے جو عِباد کہلاتے تھے۔ جاہلی شعراء میں متعدد نصرانی شاعروں کا بھی پتا چلتا ہے جنہوں نے اپنے کلام میں اپنے مخصوص نصرانی عقائد کا اظہار کیا ہے، اور اپنے خاص دینی مصطلحات کا استعمال کیا ہے! الغرض بہت سے عربی قبیلوں کو جو مذہباً نصرانی تھے، طبعی طور پر عربی زبان کے ساتھ گہرا واسطہ رہا ہے۔

اسلام کے فروغ پانے سے جزیرہ عرب میں بالآخر عیسائیت کا خاتمہ ہو گیا، لیکن عیسائیت کا عربی زبان کے ساتھ جو تعلق قائم ہو چکا تھا، وہ بدستور قائم رہا، بلکہ رفتارِ زمانہ کے اقتضاء سے اس میں اور وسعت پیدا ہو گئی۔ قرنِ اول کی اسلامی فتوحات کے بعد جب عراق، الجزیرہ اور شام میں عربوں کی حکومت قائم ہو گئی اور عربی زبان وہاں کی درباری اور دفتری زبان قرار پائی تو وہاں کے باشندوں نے جو مذہباً نصرانی تھے اور آرامی زبان بولتے تھے، اپنی قدیمی زبان کو چھوڑ کر روزمرّہ کے لئے عربی زبان اختیار کر لی۔ ان کو عربی زبان اختیار کرنے میں اس وجہ سے سہولت رہی کہ عربی ان کی قدیمی زبان آرامی سے بہت کچھ مشابہت رکھتی تھی اور ان کو آرامی سے عربی کی طرف منتقل ہونے میں کچھ دشواری نہ تھی۔ ان ملکوں کے لوگ از روئے مذہب نصرانی تھے، اس لئے اپنی دنیوی ضروریات کے علاوہ اپنے دینی لٹریچر کے لئے بھی عربی ہی کو استعمال کرنے لگے، اور اس طرح ان کے ہاں عربی زبان میں رفتہ رفتہ دینی اور دنیوی علوم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

مسیحی مصنفین

دسویں صدی میں اسکندریہ کے بطریک EUTYCHIUS نے جسے عربی میں سعید بن البطریق لکھتے ہیں، عربی زبان میں مصر کے کلیساؤں کی ایک تاریخ لکھی تھی

اور اس کا نام نظم الجوہر رکھا تھا۔ یہ تاریخ پروفیسر پوکاک کی تصحیح سے ۱۹۵۶ء میں چھپ چکی ہے۔
اسی طرح مصر کے یعقوبی فرقہ کے ایک بشپ سیوروس بن المقفع نے بھی عربی میں مصری کلیساؤں کی تاریخ قلمبند کی تھی۔ گیارھویں صدی میں الیاس بن شنایا نے جو نصیبین کا مطران تھا، اپنے ہم مذہبوں کے لئے دینی کتابیں عربی ہی میں لکھی تھیں۔ پاپائے رومہ کے کتب خانہ میں اناجیل کے جو عربی تراجم پائے جاتے ہیں، ان کی قدامت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی علماء نے اناجیل کو بہت قدیم زمانے ہی میں عربی میں منتقل کر لیا تھا۔

عربی مسیحی ادبیات کی ایک اہم شاخ میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں، جو حنین بن اسحٰق، ابو علی عیسٰی بن زُرعہ، یحییٰ بن عدی، ابن اُثال اور دانیال بن الخطّاب وغیرہ نے مسیحی دین کی حمایت میں مناظرانہ رنگ میں لکھی تھیں۔ اسی نوع کی بعض کتابوں کو PAUL SBATH نے قاہرہ سے شائع کر دیا ہے۔ مسیحی مصنفین کی بہت سی ایسی عربی تالیفات بھی ہیں، جن کا تعلق ان کی مذہبی یا سیاسی تاریخ سے ہے اور جو مسلسل طور پر معرض اشاعت میں آ رہی ہیں۔

غرضکہ مسیحی علماء کی عربی تالیفات کا جو ذخیرہ گزشتہ ایک ہزار سال میں پیدا ہوا ہے، وہ اس قدر وسیع ہے کہ متعدد فضلاء مثلاً CARL BROCKELMANN، BAUMSTARK، GROUSSEN اور GEORG GRAF نے اس کی تاریخ کو قلمبند کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ ان فضلاء میں سے G. GRAF کی تاریخ سب سے زیادہ مبسوط اور جامع ہے، جو جرمن زبان میں پانچ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ اس کی پہلی جلد رومہ میں ۱۹۴۴ء میں طبع ہوئی تھی اور آخری جلد ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی ہے[1]

حضرت عیسٰیؑ کی زبان

فی زمانا عراق، شام اور مصر کے عربی ملکوں میں عربی نہ صرف وہاں کے مسلمان عربوں کی ادبی، علمی اور تحریری زبان کی حیثیت سے رائج ہے بلکہ وہاں کے عیسائی باشندوں میں بھی اسی بے تکلفی سے مستعمل ہے۔ وہ اپنی بائبل عربی

---

[1] GEORG GRAF, GESCHICHTE DER CHRISTLICHEN ARABISCHEN LITTERATUR. 5 VOLUMES. ROME, 1944-1953.

زبان میں پڑھتے ہیں اور اپنی تمام عبادات میں عربی ہی کو کام میں لاتے ہیں، کیونکہ کئی صدیوں سے عربی ان کی مادری زبان بن چکی ہے۔ اور یہ امر باعثِ تعجب نہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰؑ بھی جو آرامی زبان بولتے تھے وہ عربی سے بہت قریب تھی۔ مثال کے طور پر انجیل مرقس کے مندرجہ ذیل جملے ملاحظہ فرمائیے:-

۱۔ اَخَذَ بیدِ الصّبیۃِ وَقال لَہَا "طلیتا قُومِی" الذی تفسیرہٗ یا صبیۃُ لكِ اقولُ قُومِی

۲۔ ثُمَّ نظَرَ اِلَی السّماءِ متنہّداً وقال لہٗ اِفَّتح ای اِنْفَتِحْ۔

۳۔ صَرَخَ یسوعُ بصوتٍ عظیمٍ قائلاً اَلُوہِی اَلُوہِی لَمَّا شَبَقْتَنِی الذی تَفسِیرُہٗ اِلٰہی اِلٰہی لِمَاذا تَرَکْتَنِی۔

عہدِ حاضر کی ادبی "نہضت"

مشرق کے نصاریٰ میں عربی زبان نہ صرف مسلمان عربوں ہی کی طرح رائج ہے بلکہ مسیحی ادیبوں نے اور نصاریٰ کے کئی مذہبی "طریقوں" (RELIGIOUS ORDERS) نے بھی عربی زبان اور ادب کی "نہضت" میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ چنانچہ مارونی (MARONITE) کرملی (CARMELITE) اور یسوعی (JESUIT) سبھی فرقوں کے علماء نے عربی کے احیاء میں بڑی جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔

جرمانوس فرحات (۱۶۷۰ء تا ۱۷۳۲ء) حلب کے ایک مارونی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں کے علماء سے تعلیم پائی اور بعد ازاں رومہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور آخر کار حلب کے بطریرک مقرر ہوئے۔ ان کو اپنی قوم کی بیداری مقصود تھی، لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ لغت فصیحہ کا احیاء بھی ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس مقصد سے نحو، خطابت اور ادبی اسلوب پر متعدد کتابیں لکھیں اور ان کو مدارس میں رائج کیا۔ ان کے علاوہ ایک عربی لغت بھی مدوّن کی اور اس میں نئے الفاظ اور نئی تعریفات شامل کیں۔

لبنان کے بستانی خاندان نے بھی عربی زبان کی بڑی قابل ستائش خدمت انجام دی ہے۔ یہ خاندان بھی مارونی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا سب سے نامور فرد بطرس بستانی تھا، جس کا سنِ ولادت ۱۸۱۹ء اور سن وفات ۱۸۸۳ء ہے۔ اس نے بیروت کے پروٹسٹنٹ کالج میں یونانی اور لاطینی کے علاوہ سامی زبانوں کی بھی تحصیل کی تھی اور دیگر علماء کے ساتھ مل کر بائبل کو عبرانی اور

یونانی سے از سرِ نو عربی میں ترجمہ کیا۔ اس نے محیط المحیط کے نام سے ایک جامع لغت بھی مرتب کی اور اس میں نئی علمی اصطلاحات کے علاوہ شام کے مخصوص الفاظ اور محاورات کو بھی شامل کیا اور پھر اس کا ایک مختصر ایڈیشن قطر المحیط کے نام سے شائع کیا لیکن بستانی کی سب سے بڑی علمی اور ادبی خدمت یہ ہے کہ اس نے ۱۸۷۵ء میں "دائرۃ المعارف" کی بنیاد ڈالی اور اس عربی انسائیکلوپیڈیا کے ذریعہ سے ابناء عربیہ میں ہر قسم کی مفید معلومات کی اشاعت کی صورت پیدا کر دی۔ اس کی ابھی سات جلدیں شائع ہوئی تھیں کہ بستانی اس دنیا سے چل بسے، لیکن اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ ان کے بعد ان کے لائق فرزند سلیم اور ان کے پوتوں نجیب اور نظیف نے دائرۃ المعارف کو بالآخر ۱۹۰۰ء میں گیارہ جلدوں میں مکمل کر دیا۔

گزشتہ صدی میں یسوعی (JESUIT) طریقہ نے بھی بیروت میں اپنا ایک مرکز بنایا اور اپنا ایک مطبع قائم کر کے رسالہ مشرق جاری کیا، جس میں علمی اور ادبی رنگ غالب تھا۔ اگرچہ ان کے اغراض طبعی طور پر تبلیغی تھے لیکن انھوں نے اپنے المطبعۃ الکاثولیکیۃ سے عربی شعر، ادب اور لغت کے متعلق بہت سی قدیم عربی کتابیں خوب صورت ٹائپ میں شائع کیں، اور اس طریق سے عربی زبان اور ادب کی بڑی خدمت انجام دی۔ ان کے سرخیل لوئی شیخو تھے۔ انھوں نے مجانی الادب کے نام سے عربی ادب کے جو منتخبات چھ حصوں میں شائع کئے، ان کو تعلیمی حلقوں میں عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے قلم سے ان منتخبات کی ایک شرح بھی ہے، جو طلبہ کے لئے بیحد مفید ہے۔ اب حال ہی میں فواد افرام بستانی کی نگرانی میں "مجانی الادب" کا ایک نیا اڈیشن مجانی الحدیثۃ کے نام سے شائع ہوا ہے جو کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں مضامین کو نئے انداز سے ترتیب دیا گیا ہے، تمام عبارت مشکول ہے اور مشکل الفاظ کی حواشی میں تشریح کر دی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں بغداد کے مشہور ادیب انستاس ماری کرملی (۱۸۶۶ء تا ۱۹۴۷ء) کا تذکرہ بھی لازم ہے۔ جو عمر بھر عربی لغت کی تحقیق اور عربی زبان کی خدمت پر کمربستہ رہے۔ آپ کو بدوِ شعور ہی سے عربی کے ساتھ جو شغف پیدا ہو گیا تھا اس کا آپ نے ایک دفعہ ذیل کے الفاظ میں اظہار کیا تھا: اِنَّ الَّذِی اَستَطِیعُ اَن اَقُولَہُ وَافتخرُ بِہٖ ھو انّنی اغرمتُ بِھٰذَا اللِّسَانِ الکریم مُنذُ نعومَۃِ اَظفارِی وبقیتُ مُولعاً بِہٖ اِلیٰ ھٰذِہِ السَّاعَۃِ مِن غَیرِ اَن یَنتَابنِی فُتورٌ

اوؔ وناءؔ۔ آپ کئی سال تک "لغۃ العرب" کے نام سے ایک علمی ادبی پرچہ نکالتے رہے جو بیشتر لسانی مسائل کی بحث کے لئے وقف تھا۔ مشرق و مغرب کے متعدد فضلاء کے ساتھ لغوی مسائل پر آپ کا مناظرہ و مباحثہ بھی جاری رہا۔ آپ کے مطبوعہ آثار میں سے حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں :۔ نشوء اللغۃ العربیۃ ونموّھا واکتھالھا، اغلاط اللغویّین الاقدمین، النقود العربیۃ۔

مشرق کے نصاریٰ نے عربی کے بہت سے شیریں مقال شاعر پیدا کئے ہیں۔ مثال کے طور پر ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے ذیل میں سلیم بن موسیٰ بستری متوفی ۱۸۸۳ء کے چند اشعار منقول ہیں، جو اس نے نئے سال کے موقع پر لطور تہنیت کہے تھے۔ زبان کی سلاست وحلاوت کے علاوہ جذبات کی لطافت بھی قابل داد ہے۔

اَتیَ العامُ الجدیدُ یزیدُ عاماً

بتاریخ المحبّۃِ وَ الوِداد

علیٰ قدرِ السّنینِ الیكَ یُھدیٰ

تحیّاتُ الوَدودِ علیٰ بعادِ

اَسَرُّ بکُلِّ عامٍ حیثُ فیہِ

محَبّتُنا تدُومُ علیٰ اتحادِ

وَ اِن کنتُ البعیدَ فاَنَّ قلبی

علیٰ طُولِ المدیٰ بین الایادی

اُوَکّلُہٗ ینوبُ الیومَ عنّی

بتقدیمِ التحیّاتِ الجدادِ